شبنم شکیل

شبنم شکیل

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

۱۹۹۴

نیاز احمد نے
زاہد بشیر پرنٹرز لاہور سے چھپوا کر
سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور
سے شائع کی۔

تعداد ـــــ ایک ہزار

قیمت ۹۹/- روپے

ISBN - 969 - 35 - 0440 - 2

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اکثر ایسے کام کئے ہیں جن میں کوئی دُکھ نہ سُکھ
اکثر ایسے لوگ ملے ہیں جن سے بیر نہ پیار
دُشمن اور نہ دوست
اکثر اُن سے باتیں کی ہیں مہمل اور بے رس
ایک گناہِ بے لذّت میں ساری عُمر گنوائی
اِسی لئے تو بنجر دن اور بنجر راتوں میں
دِل کی اِس بے آب کیاری میں وہ پھُول کھِلے
جن میں رنگ نہ بُو
یہ پھُولوں کا گلدستہ
اُن لوگوں کے نام

شبنم شکیل

○

اکثر اپنے در پئے آزار ہو جاتے ہیں ہم
سوچتے ہیں اس قدر بیمار ہو جاتے ہیں ہم

مضطرب ٹھہرے سو شب میں دیر سے آتی ہے نیند
صبح سے پہلے مگر بیدار ہو جاتے ہیں ہم

نام کی خواہش ہمیں کرتی ہے سرگرمِ عمل
اس عمل سے بھی مگر بیزار ہو جاتے ہیں ہم

جھوٹا وعدہ بھی اگر کرتی ہے ملنے کا خوشی
وقت سے پہلے بہت تیار ہو جاتے ہیں ہم

کچھ بھی خواہوں کے ہاتھوں ہوتی ہے دشنام کی
سنگ باری اس پہ اور مسمار ہو جاتے ہیں ہم

بھول کر وہ بخش دے گر روشنی کی اِک کرن
دائمی شہرت کے دعوے دار ہو جاتے ہیں ہم

مطمئن ہونا بھی اپنے بے خبر ہونے سے ہے
بے سکوں ہوتے ہیں جب ہشیار ہو جاتے ہیں ہم

زندگی سے دُور کر دیتا ہے اکثر خوفِ مرگ
آپ اپنی زندگی پہ بار ہو جاتے ہیں ہم

اک ذرا سی بات اور پھر اشک تھمتے ہی نہیں
لہر سی اک دل میں اور سرشار ہو جاتے ہیں ہم

○

دکھ کا منتر پڑھتی ہوتی ہوں
میں غربت میں بڑی ہوتی ہوں

ان میں وقت ہی ضائع ہوگا
جن باتوں میں پڑی ہوئی ہوں

راج سنگھاسن ہے یہ میرا ؟
یا سولی پر چڑھی ہوئی ہوں

آدھی ریت سے باہر ہوں میں
آدھی ریت میں گڑی ہوئی ہوں

آدھی مان چکی ہوں اس کی
آدھی بات پہ اڑی ہوئی ہوں

مجھ کو گرانا سہل نہیں ہے
اپنے سہارے کھڑی ہوئی ہوں

○

لہو اس دل سے اب رستا نہیں ہے
یہ میرے واسطے اچھا نہیں ہے

خود اپنا ساتھ کب تک دے سکوں گی
یہ میں نے آج تک سوچا نہیں ہے

خوشی کا تاج واپس کر دیا ہے
یہ میرے سر پہ کچھ سجتا نہیں ہے

مجھے جانا ہے جس کو پار کر کے
ابھی رستے میں وہ دریا نہیں ہے

ہے سب کچھ آنکھ میں تحریر اس کی
مگر دِل ہی اسے پڑھتا نہیں ہے

وہی اک بات ہے بس کہنے والی
یہاں جس کو کوئی کہتا نہیں ہے

کھڑی ہوں کب سے میں کشکول تھامے
مگر بابِ ہنر کھلتا نہیں ہے

عدلِ دیر یاب

میری تار تار محبتیں
میری دِل فگار محبتیں
میری بے وقار محبتیں
میری بار بار محبتیں
سبھی مستعار محبتیں
جو اُجڑ سکیں نہ پنپ سکیں
سرِ شاخِ دِل نہ سجا کبھی
کوئی لمحہ کھِلتے گلاب سا
سرِ بابِ جاں نہ رقم ہوا
کوئی سانحہ کوئی المیہ
مری بے یقین محبتیں
کہ عطا ہوا انہیں دہر میں
نہ شرف ہی شہرتِ عام کا

نہ سند ہی کوئی دوام کی
نہ وصال میں کوئی سرخوشی
نہ تو شدتِ غمِ ہجر ہی
جو گریزاں ان سے صعوبتیں
سبھی راحتیں بھی تھیں اجنبی
نہ رفاقتوں میں خلوص تھا
نہ تھیں استوار رفاقتیں
کسی قید میں کسی جبر میں
رہیں کورِ چشم بصارتیں
سو کتابِ جاں کی عبارتیں
نہ سیہ ہوئیں نہ سفید ہی
وہی ایک رنگ تھا سرمئی
وہ جو پیرہن کا ہے شام کے
یونہی عمر ساری گذر گئی
کسی سرکشیدہ سوال میں
کسی خواب کے سے خیال میں
کسی خوف جیسے ملال میں
اِک عجب سی صورتِ حال میں
میری بدنصیب محبتو

میری ایک بات یہ جان لو
کبھی معتبر بھی جو ہو گئیں
اسی زندگی ہی میں تم اگر
تو یہ دیریاب خوشی مجھے
نئے دکھ سے کر دے گی آشنا
میں کہاں سے ڈھونڈ کے لاؤں گی
وہ خوشی برتنے کا ذوق و شوق
جسے وقت لے کے بھی جا چکا

موت کے کنویں میں موٹر سائیکل چلانے والی

اس تماشا گاہ کے
خوف کے حصار میں
دیکھنا بھی جرم تھا
چیخنا بھی جرم تھا
سوچنا بھی جرم تھا
چھپ کے ناظرین سے
چھپ کے سامعین سے
چھپ کے آسمان سے
چھپ کے اس زمین سے
دیکھتی بھی تھی مگر
چیختی بھی تھی مگر

سوچتی بھی تھی مگر
وہ کہ جس کی زندگی
گول گول گھومتے
دائروں میں کٹ گئی

○

اُسی بے نام سرشاری اُسی وحشت میں رہنا ہے
بہت دیکھے تھے جس کے خواب اس جنت میں رہنا ہے

یہ جیسا بھی ہے، اچھا یا برا ہے، میرا گھر ہے یہ
یہیں رہنا ہے مجھ کو اور ہر حالت میں رہنا ہے

اسی طائر سے پوچھو آشیاں کی عافیت کیا ہے
جسے اک مستقل اندیشۂ ہجرت میں رہنا ہے

ابھی سے ثبت کر دو بڑھ کے اس پہ نقشِ پا اپنے
وگرنا زندگی کو ہر گھڑی عجلت میں رہنا ہے

ابھی سے ہی ثنا خوانی میں ہے مشغول دل اس کی
جسے ملنا ہے اور پھر دیر تک حیرت میں رہنا ہے

کوئی آشوب ہو، ماں کی دعائیں ساتھ ہیں جب تک
حصارِ امن میں ہوں، خیر کی ساعت میں رہنا ہے

○

حکم نامے نئے تحریر کئے جاتے ہیں
اب یہاں خواب بھی زنجیر کئے جاتے ہیں

جس سے مِل سکتا ہے مظلوم کو انصاف یہاں
اُس گواہی میں ہی تاخیر کئے جاتے ہیں

زندگی چھُپ کے ہنسا کرتی ہے ہم پر اور ہم
اُس کی پرچھائیں کو تصویر کئے جاتے ہیں

حیف وہ طائرِ خوش رنگ کہ سب جس کے لئے
دانہ و دام کی تدبیر کئے جاتے ہیں

چلتے جاتے ہیں، پہنچ پاتے نہیں پھر بھی کہیں
اور اِسے زیست سے تعبیر کئے جاتے ہیں

○

ہم حدِ ماہ و سال سے آگے نہیں گئے
خوابوں میں بھی خیال سے آگے نہیں گئے

ہر حد سے ماورا تھی سخاوت میں اس کی ذات
ہم آخری سوال سے آگے نہیں گئے

کچھ وہ بھی التفات میں ایسا سخی نہ تھا
کچھ ہم بھی عرضِ حال سے آگے نہیں گئے

تھیں تو ضرور منزلیں اس سے پرے بھی کچھ
لیکن ترے خیال سے آگے نہیں گئے

کیا ظلم ہے کہ عشق کا دعویٰ انہیں بھی ہے
جو حدِ اعتدال سے آگے نہیں گئے

کچھ خود سری کے فن میں نہ تھے ہم بھی کم مگر
اُس صاحبِ کمال سے آگے نہیں گئے

سوچا تھا میرے دکھ کا مداوا کریں گے کچھ
وہ پرسشِ ملال سے آگے نہیں گئے

لاہور پیچھے رہ گیا ہم باوفا مگر
اُس شہرِ بے مثال سے آگے نہیں گئے

○

پوچھتے کیا ہو کیوں کر ہم پہنچے ہیں ایسے حالوں میں
ہم جیسے بھی پڑ جاتے ہیں دنیا کے جنجالوں میں

جس قصے کو ختم کیا جا سکتا تھا کچھ لمحوں میں
سوچ بچار ہی کر پائے ہیں اس پہ اتنے سالوں میں

خوابوں سے محروم رہا کرتے ہیں دنیا جیت کے بھی
ایک کمی اکثر یہ رہ جاتی ہے جاگنے والوں میں

ایک بھی گہنا پاس نہیں تھا جب یہ چہرہ کندن تھا
سونا تن پر تب پہنا جب چاندی اتری بالوں میں

روزِ ازل سے طے یہ ہوا تھا کٹ جائے بس ایسے ہی
میری عمر جواب دہی میں، تیری عمر سوالوں میں

اپنا آپ مٹا ڈالا ہے اس بیکار سی خواہش میں
میرا ذکر کتابوں میں ہو، میرا نام رسالوں میں

چہک پرندوں کی ہی لے آتی ہے زیرِ بام اُنھیں
اک حوالہ خوش گفتاری بھی تھا میرے حوالوں میں

حسابِ دوستاں

اِک دوجے پہ کڑوے کسیلے لفظوں کی بوچھاڑ
ہر دو جانب سے طعنوں کی دو دھاری تلوار

تذلیل و توہین کے جُملے دن میں سو سو بار
ایسے ایسے زخم کہ جن پہ ہر مرہم بے کار

طنز و تشنیع و الزام تراشی کی بھرمار
پہلے سے مجروح اَنا پر اور بھی گہرے وار

اشکوں کے اور آہوں کے پھر کچھ اوچھے ہتھیار
ایسا ایک محاذ کہ جس پہ کسی کی جیت نہ ہار

اور کسی کا ہاتھ ہے جس نے کھینچی یہ دیوار
ورنہ یوں کیوں زہر اُگلتا سترہ سال کا پیار

○

چلتے رہے تو کون سا اپنا کمال تھا
یہ وہ سفر تھا جس میں ٹھہرنا محال تھا

اک دوسرے کا قرب ہوا خوف میں نصیب
اب شہر میں ہر اک کو ہر اک کا خیال تھا

آ پہنچی فیصلے کی گھڑی، پہ نہ کھُل سکا
جینا تھا سہل یا مجھے مرنا محال تھا

رہتی تھی اس میں آٹھ پہر اک چہل پہل
رونق میں دل کا شہر کبھی بے مثال تھا

میں خود میں گم تھی، اور مجھے اپنی خبر نہ تھی
دیکھا جو آئنہ تو عجب میرا حال تھا

اک سایہ میرے ساتھ جو چلتا تھا رات دن
مجھ سے بھی بڑھ کے اس کو تو میرا خیال تھا

آخر شکستِ دل مرا اعزاز بن گئی
باعث مرے عروج کا میرا زوال تھا

○

مَیں نادہندہوں اِک، اور بُرا ہے حال مرا
بندھا ہے قرضِ محبت میں بال بال مرا

وہ بے نیاز تھا لیکن اُسی کو رہ رہ کے
ہر ایک گام پہ آتا رہا خیال مرا

تو خوفِ عذر وضاحت میں مبتلا کیوں ہے
کہ اب جواب کا طالب نہیں سوال مرا

وہ اپنے زعم میں جو چاہے اب سمجھتا رہے
خدا بنانا اُسے ہے مگر کمال مرا

سکھائی ہے مجھے حالات نے اداکاری
سو میری بات سے کھلتا نہیں ہے حال مرا

"میں دشتِ غم میں ہوں صیاد دیدہ اِک آہو"
یقین اب نہیں ہو گا کبھی بحال مرا

اگلے جہاں پہ مجھ کو کوئی نہیں بھروسا

فردا کی زندگی پر
مجھ کو یقیں کہاں ہے
میں بے یقین ایسی
میرے قریب آ کر
ہر زندگی سراسر
اِک وہم بنتی جائے
سائے میں ڈھلتی جائے

اپنے سوالوں کے جواب میں

چلنے دو یونہی قافلۂ غم کو ذرا دیر
تم اِس کی روانی میں رکاوٹ تو نہ ڈالو
تھم جاؤ مرے ذہن کے بے کار سوالو
سو بار ہوئی وقت کے ہاتھوں سے ہمیں مات
گنتا رہے اب کون زمانے کی فتوحات
لیکن تمھیں اِک راز بتاتے ہیں، سُنو تم
دنیا ہمیں اب مشقِ ستم لاکھ بنائے
ہم عذر و وضاحت سے ہیں آگے نکل آئے

مقبوضہ کشمیر میں کشمیری بچّوں کی جھلسی ہُوئی لاشوں کی تصویر دیکھ کر

کوئی بھی سانحہ دنیا میں گذرے
خدا جیسے نظامِ زندگی کو
بدلنے میں یقیں رکھتا نہیں ہے
کہ وہ بھی سب بڑے جاگیرداروں کی طرح سے
سٹیٹس کو
کا حامی ہو گیا ہے۔

رُونما ہو گئے کیس

سوالی بن کے خوشیوں کی گدائی کرنے نکلی تھی
لیے پھرتی رہی پھرتی رہی کشکول تک برسوں
"خدا کے نام پر بابا مسرت کا بس اک لمحہ"
بہت شہرہ سنا ہے آپ کے جود و سخاوت کا
فقیرانہ صدا دیتی گلی کوچوں سے جو گذری
رگ جاں میں ہوئے پیوست ناوک طنز کے کتنے
جھلکتا تھا تمسخر کیسا مرد و زن کی آنکھوں سے
اڑائی کیسے اوچھے اہلِ دولت نے ہنسی میری
"بہت ہی لالچی ہے یہ بھکارن" پھر سے آ پہنچی
اسے کل کی بچی خوشیوں کا صدقہ دے دیا جائے

مگر یہ پھر نہ آئے صاف اس کو کہہ دیا جائے
خوشی کی سرخوشی میں مجھ کو ہر ذلت گوارا تھی

اسی دھندے میں آخر زندگی کی شام بھی آئی
مجھے جب لوٹ کر جانا پڑا اپنے ٹھکانے پر
مرے لب گنگناتے میری آنکھیں مسکراتی تھیں
مری جھولی میں رنگا رنگ خوشیاں جگمگاتی تھیں
در اپنا کھٹکھٹایا میں نے کن پُر شوق ہاتھوں سے
پہ چونک اٹھی اچانک دیکھ کر میں اپنے سائے کو
"تھا تو ساتھ میرے" میں نے ہکلاتے ہوئے پوچھا
مرے لہجے میں اب بھی التجا تھی بھیک منگوں جیسی
"نہیں تم اس سفر پر بے اماں تھیں اور بے سایہ"
ترحم سے بھرا یہ دان تم کو ہی مبارک ہو
بڑھائیں گھر کی شوبھا کو یہ چیزیں مانگے تانگے کی

ورثہ

بہت آسان سی راتیں بہت آسان سے دن ہیں
نہ بے کل دن میں رہتی ہوں نہ شب کی نیند اڑتی ہے
نہایت چین سے آرام سے اپنی گزرتی ہے
کہ اب دامن میں گنجائش نہیں انگار جذبوں کی
مقرر راستے پر کاروانِ زیست چلتا ہے
مخالف یا موافق ہو ہوا راحت نہیں دیتی
برس کر ابر کھل جاتے پر اب روزن نہیں کھلتا
شگفتِ گل پہ بھی زنجیرِ پا حرکت نہیں کرتی
گلوں کو توڑ کر گلدان میں ایسے سجاتی ہوں
کہ جیسے فرض ہو کوئی جسے انجام دینا ہے

نہیں ہے کوئی بھی مطلب مجھے مہتاب راتوں سے
ستارے جو سخن کرتے ہیں ان باتوں سے کیا لینا
بھرا ہو کہ یا خالی آسماں معنی نہیں رکھتا
مجھے بے سود باتوں سے نہیں اب کوئی دلچسپی
کتابیں پاس ہیں لیکن انہیں میں پڑھ نہیں سکتی
وہ اِک ترتیب سے رکھی بھلی معلوم ہوتی ہیں
کہاں ہیں وہ جو میرے پاس تصویریں پرانی تھیں
تھے کچھ خط بھی جنہیں میں نے بہت پہلے جلا ڈالا

۲

نئے اب قاعدے قانون دنیا نے سکھاتے ہیں
"ثبوتِ طبعِ ناقص ہے بلند آواز میں ہنسنا"
"پرندے چہچہاتے ہیں تو کتنا شور اٹھتا ہے"
"گذرنا حد سے اُلفت میں کبھی اچھا نہیں ہوتا"
"اصولوں پر بھی سمجھوتا روا ہوتا ہے دنیا میں"
ہو کوئی فیصلہ جذبات میں آکر نہیں کرتی
اسی میں خیر ہے شاید اسی میں بہتری میری
مٹا ڈالا ہے اب دل سے وہاں جو نام کندہ تھا
جسے سن کر کبھی یہ دل دھڑکنا بھول جاتا تھا

نہیں اب میری دنیا میں کچھ ان چیزوں کی جا باقی

۳

یہ سب اچھا سہی لیکن نہ جانے کس لیے پھر بھی
میں اکثر دل ہی دل میں سوچ کر کچھ کانپ اٹھتی ہوں
کہ اب میری شباہت کی مری نازوں پلی بیٹی
مری سب ترک کردہ سوچ کے بے کار ورثے کو
اکٹھا کر رہی ہے اور جھولی بھرتی جاتی ہے

بانجھ پن کی بددُعا

لو رات وہ دردِ زہ میں ہوئی پھر سے مُبتلا
دردِ قدیم اس کا مقدر ازل سے ہے
چہرہ سیاہ پڑنے لگا
درد و کرب سے
رگ رگ میں دوڑتا ہوا
نس نس میں پھیلتا ہوا
اِک خوف بھی ہے ساتھ
وہ موت اور حیات کی اُس کشمکش میں ہے
جو لازمی ہے اِک نئی تخلیق کے لئے

بس تھوڑی دیر ہی میں
جنم دے چکے گی یہ
لتھڑا ہوا شکوک میں
بے اعتبار دن
اور اُس کو دیکھ کر
آئے گی اس کے لب پہ فقط ایک بددعا
ساقط ہو اگلی بار حمل اُس کا اے خُدا

الگ الگ سیّاروں میں

شوقِ تنوع کے باعث
اپنے ہی ہمزاد سے اکثر
مجھ کو شکایت رہتی ہے
اس کو بدلنا چاہتی ہوں
اپنے ساتھ
لے کر چلنا چاہتی ہوں
آگے بڑھنا چاہتی ہوں
لیکن اس کو
میرا پاس نہیں

میرا اس کا ساتھ ہے یوں
جیسے جڑواں بچے دو
قدرت کی بے رحمی سے
آپس میں پیوستہ ہوں
یا جیسے دو قیدی ہوں
اک زنجیر سے بندھے ہُوئے
جاں لیوا احساس ہے اک
شدت کی مجبوری کا
اس سے الگ ہونے کی خواہش
جب بھی کروٹ لیتی ہے
میں زخمی ہو جاتی ہوں

○

بسے ہوئے تو ہیں لیکن دلیل کوئی نہیں
کچھ ایسے شہر ہیں جن کی فصیل کوئی نہیں

کسی سے کس طرح انصاف مانگنے جاؤں
عدالتیں تو بہت ہیں، عدیل کوئی نہیں

سبھی کے ہاتھوں پہ لکھا ہے ان کا نام و نسب
قبیل دار ہیں سب، بے قبیل کوئی نہیں

ہے دشتِ غم کا سفر اور مجھے خبر بھی ہے
کہ راستے میں کہیں سنگِ میل کوئی نہیں

ابھی سے ڈھونڈ کے رکھو نظر میں راہِ مفر
یہاں ہے پیاس سے مرنا، سبیل کوئی نہیں

مری شناخت الگ ہے، تری شناخت الگ
یہ زعم دونوں کو، اپنا مثیل کوئی نہیں

○

سب وا ہیں دریچے تو ہوا کیوں نہیں آتی
چپ کیوں ہے، پرندوں کی صدا کیوں نہیں آتی

گل کھلنے کا موسم ہے تو پھر کیوں نہیں کھلتے
خاموش ہیں کیوں پیڑ، صبا کیوں نہیں آتی

بے خواب کواڑوں پہ ہوا دیتی ہے دستک
سوئے ہوئے لوگوں کو جگا کیوں نہیں آتی

سنتے ہیں کہ منظر ہے بدلنے کو چمن کا
پھر اس کی گواہی کی ندا کیوں نہیں آتی

کیوں ایک سے لگتے ہیں یہاں اب سبھی موسم
خوشبو کسی موسم سے جُدا کیوں نہیں آتی

سونا ہے مجھے اب تو وہی اوڑھ کے شبنمؔ
میرے لئے پھُولوں کی ردا کیوں نہیں آتی

○

رسوائی کا بھی ہم پر الزام ضروری تھا
جو دل نے کمایا ہے وہ نام ضروری تھا

مرتے ہی رہے پیہم اور جی کے نہیں دیکھا
ہم بھُول گئے شبنمؔ جو کام ضروری تھا

کیا کیا نہ گیا اُس تک دنیا کے توسط سے
پہنچا نہیں بس اک جو پیغام ضروری تھا

کرتا جو وضاحت وہ ہم زندہ کہاں رہتے
باتوں میں جو تھا اُس کی ابہام ضروری تھا

کچھ ایسا انوکھا تھا اپنا یہ سفر، جس میں
جینے کے لئے مرنا، ہر گام ضروری تھا

زہرِ غمِ دنیا کے تریاق کی خاطر سے
زہرِ غمِ جاناں کا اک جام ضروری تھا

اک عمر دیا اس نے جو ساتھ، وہ کافی ہے
اب تھک سا گیا تھا دل، آرام ضروری تھا

○

وہ ساجن ہو کے بھی ساجن نہیں ہے
سکھی۔ یہ پریم ہے بندھن نہیں ہے

ادھورا ہے ہر اک سپنا ہمارا
کبھی جھولے کبھی ساون نہیں ہے

کھلونے پاس ہیں حیرانیوں کے
اگرچہ اب مرا بچپن نہیں ہے

یہ مرجاتی ہے اپنی موت خود ہی
محبت کا کوئی دشمن نہیں ہے

ہے میرے ہاتھ میں اب ہاتھ میرا
کسی یوسف کا بھی دامن نہیں ہے

چھپوں کیسے میں آخر زندگی سے
کہ اب دل میں وہ سُندر بَن نہیں ہے

O

لاحاصلی کا عشق میں چرچا نہیں کیا
دُنیا جو چاہتی تھی تماشا نہیں کیا

ہم مصلحت پسند تھے برباد ہو گئے
جو کچھ بھی جس طرح سے بھی سوچا نہیں کیا

ظلمت گزیدگاں کی رہی دِل دہی عزیز
اپنے لئے الگ سے سویرا نہیں کیا

زردار و بے نوا سے کیا ایک سا سلوک
دِل نے کوئی لحاظ کسی کا نہیں کیا

کر کے دکھائی ہم نے اُسے بے وفائی بھی
اُس کے حصول کے لئے کیا کیا نہیں کیا

منظر سے ہٹ کے کر دیا آساں جُدائی کو
اِس فیصلے میں بھی اُسے تنہا نہیں کیا

خوش فہمیوں میں خوب گزر سکتی تھی مگر
ہم نے خود اپنے آپ سے دھوکا نہیں کیا

"یادِ اُس کی اتنی خوب نہیں تھی بقولِ میرؔ"
لیکن اُسے بھلا کے بھی اچھا نہیں کیا

○

محبت کی حدوں کو پا گئی ہوں
میں اس کے در سے واپس آ گئی ہوں

مجھے تنہائیوں کی دھوپ لا دو
کسی کے سائے میں مرجھا گئی ہوں

ہوں واقف شہرِ غم کے راستوں سے
وہاں پہلے بھی میں تنہا گئی ہوں

ابھی کچھ دیر اِس دنیا میں رہتی
مگر میں اب بہت گھبرا گئی ہوں

مرا جینا بھی تو اک معرکہ تھا
اسی میں آخرش کام آگئی ہوں

ایک گاؤں کی کہانی

میلے دل کے لوگوں کی
اک گرد آلود ملالوں کی شب بستی میں
ایک گلابی نار نے
اپنے چن چہرے پر اوڑھی چُنری
مدھم مدھم سوگی سوگی رنگوں کی
جس سائے میں کُجلا جائے
چاند کلائی کچی پکی ونگوں کی
لیکن فطرت کی جوت جوالا
کب روکے سے رُک سکتی تھی
اس مٹیالی چُنری میں بھی اک مست الست اجالا تھا
جیسے سرسوں کے کھیت پہ پورا چاند چمکنے والا تھا

بستی کے کالے ذہن کے لوگ اس پر بھی مگر چلائے بہت
مٹیالی چنری میں دیکھو مکھ اِس کا لشکائے بہت

وہ نار اِن طعنوں مہنوں پر
ہَرنی کی طرح گھبرائی بہت
اپنے خوش شبیق مکھڑے کی شوبھا پر بھی شرمائی بہت
گھبرا کر اُس نے گاؤں کی مٹی سے چہرے کو گردایا
تب کور نظر چھوٹے دِل والے لوگوں کو کچھ چین آیا

خواب

کسی شاعر سے کبھی خواب نہ چھینو اس کے
خواب چھینو گے تو بے موت ہی مر جائے گا
اور کچھ ہاتھ تمہارے بھی نہیں آئے گا
اس کی فطرت میں ہے بس خواب نگر میں رہنا
جس کی پونجی ہوں فقط خواب اسے کیا کہنا
خواب کی دھن پہ وہ متوالا مگر جب بھی کبھی
گنگناتا ہے کوئی گیت تو گھبراتے ہو
تم پرندوں کے چہکنے سے بھی ڈر جاتے ہو
کس لئے بنتے ہو تم سازِ سخن کے دشمن

کس لئے ہوتے ہو بے ساختہ پن کے دشمن
تم سے اُمید مگر کیا کوئی رکھی جائے
تم تو زنجیر کیا کرتے ہو خوابوں کو بھی اب
فردِ جرم ان پہ صداقت کی اگر لگ جائے

○

زمانہ ساز ہوتی جا رہی ہوں
مجھے روکو، سنبھلتی جا رہی ہوں

نہتا کر دیا ہے اس نے مجھ کو
ہر اک سے صلح کرتی جا رہی ہوں

ہرا ہونے کو باطن کا شجر ہے
میں خود جڑ سے اکھڑتی جا رہی ہوں

کہیں معدوم ہی اب ہو نہ جاؤں
کہ اک سائے میں ڈھلتی جا رہی ہوں

بزرگوں پہ تھا میرے قرض کوئی
سو میں بیگار بھرتی جا رہی ہوں

ہے اتنا کام، مہلت کم ہے اور میں
یونہی بس ہاتھ ملتی جا رہی ہوں

○

تھے اچھے بے سر و سامانیوں میں
پڑی ہیں مشکلیں آسانیوں میں

جدا ہوں زندگی کی لہر سے مَیں
بندھی ہے ناؤ بہتے پانیوں میں

کنارے پر پہنچ کر خوف آیا
کہ اب تک ہم تھے کن طغیانیوں میں

محبت کاش قدرِ مشترک ہو
جہانِ حرف کے سیلانیوں میں

کسی تخلیق کا ہے استعارہ
عجب سی سرخوشی حیرانیوں میں

چھپانا زخم اک مقصود ہے پھر
سو ہیں پھر محوِ گل افشانیوں میں

○

مایا کا ہے سب جال بہت دیکھ چکی ہوں
دنیا کا ہے کیا حال بہت دیکھ چکی ہوں

چھوٹی سی تھی جب خود سے جدا کر دی گئی میں
فرقت کے مہ و سال بہت دیکھ چکی ہوں

منظر کئی آنکھوں سے نہاں کر دیئے اس نے
میں پھر بھی بہر حال بہت دیکھ چکی ہوں

ڈرتی ہوں ہر اک شے کی فراوانی سے اب میں
ہر شے کا کبھی کال بہت دیکھ چکی ہوں

پانسے بھی امیروں کے ہی ہوتے ہیں سو انکی
چل جاتی ہے ہر چال بہت دیکھ چکی ہوں

اپنا تو بس اب پاپ ہی کٹ جائے تو اچھا
یہ کشٹ یہ جنجال بہت دیکھ چکی ہوں

ترانہ

چندے آفتاب ہے
چندے ماہتاب ہے
عشق اک گلاب ہے
نغمۂ رباب ہے
عشق اِک کتاب ہے
عشق کی کتاب میں
روشنی کا باب ہے
روشنی کے باب کا
اور ہی عذاب ہے
عشق زہرِ ناب ہے
عشق اِک عذاب ہے
عشق اک سراب ہے

عشق کے سراب میں
ایک آب و تاب ہے
عشق اِک حجاب ہے
عشق کے حجاب ہیں
زیست بے نقاب ہے
عشق لاجواب ہے
عشق کی زکوٰۃ کا
اور ہی حساب ہے
عشق کا فقیر بھی
صاحبِ نصاب ہے
عشق اِک شراب ہے
عشق کی شراب ہیں
زندگی کا خواب ہے
زندگی کے خواب ہیں
زندگی خراب ہے۔

ہر خواب ہمارا تھا فردا کے حوالے سے

ہر آج مرا گروی، ہر کل کے حوالے سے
ہر آج کو میں پیہم داؤ پہ لگاتی ہوں
سولی پہ چڑھاتی ہوں
مٹی میں ملاتی ہوں
ہر کل کی پرستش میں، ہر آج کو کھوتی ہوں
اور بیٹھ کے روتی ہوں
جو آج میسر ہے
وہ کل کو نہ چھن جائے
اس خوف کے ہاتھوں بھی کیا کیا نہ کیا میں نے
ہر ایک مسرت کو فردا پہ اٹھا رکھا
فردا کے لئے قتلِ امروز روا رکھا
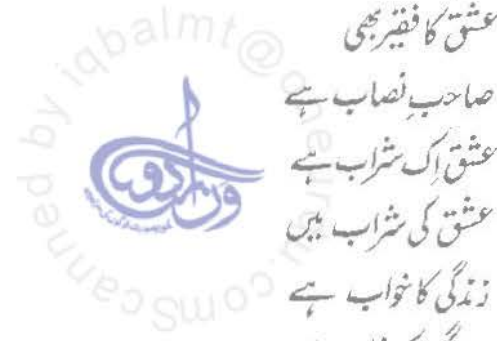
قاتل ہوں مگر مجھ کو پہچانے کوئی کیسے
تابوت ہیں یہ کل کے
مقتول کی صورت جو اوڑھے ہوئے رہتی ہوں
ہاتھوں پہ مگر میرے
جو خون کے دھبے ہیں
فریاد کریں کس سے
منصف کسے ٹھہرائیں
جائیں تو کہاں جائیں
کوئی تو ہو ایسا جو
فریاد سنے ان کی
انصاف کرے ان سے
قاتل مجھے ٹھہراتے
تابوت میں کل کے وہ
کیل آخری جڑ جائے ......

○

محور ہو مری سوچ کا برسوں کا یقیں ہو
تم جو کہ فقط وہم ہو اور کچھ بھی نہیں ہو

میرے ہی تخیل نے تراشا ہے یہ پیکر
تم میری غزل کی کوئی شاداب زمیں ہو

لازم ہے حفاظت بھی تو اس خانۂ دل کی
رہتے ہو مرے گھر میں مگر کیسے مکیں ہو

اب اس کی تپش مجھ کو ٹھہرنے نہیں دیتی
حسرت تھی مرے پاؤں کے نیچے بھی زمیں ہو

ہو میری طرح تم بھی تو اپنے سے ہراساں
شاید اسی نسبت سے رگِ جاں سے قریں ہو

O

غم مجھے اس کی جدائی کا کہاں تھا پہلے
دُور تھا پر وہ قریبِ رگِ جاں تھا پہلے

اب تو آ پہنچے کئی اور بھی دشوار مقام
اس کی چاہت میں فقط جی کا زیاں تھا پہلے

وقت کی گرد نے دھندلا دیئے سب نقش و نگار
ورنہ دِل ایک ڈھنگ تنگ مکاں تھا پہلے

ہر خوشی میں کوئی غم یاد دلا دیتا ہے
دل کا یہ رخ میری آنکھوں سے نہاں تھا پہلے

مڑ کے تکنے سے ہوا اپنا سفر اور کٹھن
وہ پکارے گا ہمیں کب یہ گماں تھا پہلے

ہر چبھن دل کی یہ کہتی ہے کہ وہ اک کانٹا
آج تک ہے وہیں موجود جہاں تھا پہلے

○

یہ سرابِ روشنی ہے روشنی کیسے کہوں
ایک خوابِ زندگی کو زندگی کیسے کہوں

دِل کے دریا میں خس و خاشاک بھرنے کے سبب
آ گئی اس کی روانی میں کمی کیسے کہوں

میں حصولِ نام و منصب میں رہی مصروف کچھ
کب ہوئی بے آبرو یہ زندگی کیسے کہوں

اپنے بدلے میں اسے تاوان بھاری چاہیئے
مجھ سے کیا کچھ مانگا کرتی ہے خوشی کیسے کہوں

دِل کے آئینے پہ جن کرنوں کی ہے جلوہ گری
یہ بھی عکسِ روشنی ہے روشنی کیسے کہوں

حالِ دل میری اَنا لکھنے نہیں دیتی مجھے
لفظ کی بازی گری کو شاعری کیسے کہوں

میرے اپنے

آنے لگتی ہے مجھے نیند ذرا جب بھی کبھی
کچھ ہیولے سے مرے کمرے میں در آتے ہیں
چیختے شور مچاتے ہوئے روتے روتے
دائرہ گرد مرے ایک بنا لیتے ہیں
اور اڑ جاتی ہے جب نیند مری آنکھوں سے
رقص کرتے ہیں مرے سامنے اور گاتے ہیں
گیت کے بول مجھے صاف سمجھ آتے ہیں
ہم تمہارے ہیں تمہارے ہیں ہمیں اپنا لو

سُود و زیاں

اپنے خوابوں کو جو تعبیر نہیں دے پاتا
جو بدل سکتا نہیں ان کو حقیقت میں کبھی
وہ یہاں راندۂ درگاہ ٹھہر جاتا ہے
ایسے افراد کہ جو
خواب کی تعبیر پہ ہوتے ہیں مُصر
کاش بس اتنی حقیقت ہی سے واقف ہو جائیں
کم نہیں خواب کی تعبیر سے کچھ قیمتِ خواب
لذّتِ خواب

پہنچی وہیں پہ خاک

لہو زنجیر کیا ہے کس نے ؟
کس نے تپتے ہوئے لوہے سے اسے داغا ہے ؟
کس نے یہ طوق غلامی کا اسے ڈالا ہے ؟
پا بہ گل اس کو کٹہرے میں کھڑا کس نے کیا ؟
کس نے کوڑوں کی سزا دی اس کو ؟
کون سے جرم کی پاداش تھی یہ ؟
یہ تو آزاد ہوا تھا پیدا
ایک صحرا میں رہا کرتا تھا
ایک صحرا کہ جو محفوظ نہیں تھا لیکن
بطنِ مادر کی طرح جس میں تھی نرمی بھی بہت

اور گرمی بھی بہت
یہ مگر کیسے ہوا ؟
آگیا کیسے اچانک ہی یہ نرغے میں
چار سو شور بپا تھا جیسے
اس کی تہذیب کرو
اس کی تطہیر کرو
اس کو زنجیر کرو
ہاں مگر آج بھی آتی ہے اسے
دور افتادہ مقاموں سے کہیں
نیم وحشی سی کسی ڈھول کے بجنے کی صدا
کھول جاتا ہے یہ زنجیروں میں
تیز ہو جاتی ہے گردش اس کی
اس قدر تیز کہ محسوس یہی ہوتا ہے
ڈھول کی تال پہ جیسے کہ لہو رقص میں ہے

منکہ صغریٰ خانم

دیکھو بیٹی !

ایک سیدھی اور سادہ زندگی کرنا بسر
جس میں کوئی خوف ہو ہرگز نہ ہو کوئی خطر
جس میں کوئی کشمکش اور کوئی دوراہا نہ ہو
تم نے شاید اس طرح سوچا نہ ہو چاہا نہ ہو
میں مگر موجود ہوں سب کچھ بتانے کے لئے
ایک سیدھا راستہ تم کو دکھانے کے لئے
چاہتی ہو کاٹنا گر خیر سے اپنا سفر
آج سے میری نصیحت کو رکھو پیشِ نظر
جس نے رستہ اک الگ اپنے لئے چاہا یہاں
اُس کے حصے میں یہاں آئیں فقط رسوائیاں

کوئی سودا سر میں رکھنے میں ہے عافیت کہاں
اس جگہ خوابوں کی اُڑ جاتی ہیں اکثر دھجیاں
دیکھو خوابوں کے نگر میں تم نہیں رہنا کبھی
میں نے سمجھایا نہیں تھا، یہ نہیں کہنا کبھی
مصلحت کا راستہ آسان ہے مشکل نہیں
ایسے جینا جیسے سینے میں تمہارے دل نہیں
دل کی مانو گی اگر، پچھتاؤ گی تم ایک دن
اپنی حالت پر بہت شرماؤ گی تم ایک دن
دل کے ہاتھوں ٹھوکریں کھاتی پھریں دل دادیاں
چوڑیاں ہاتھوں میں ہیں، نہ کان میں ہیں بالیاں
مجھ کو دیکھو آج تک دل کی کبھی مانی نہیں
کچھ بھی ہوں پر یہ تو مانو گی کہ دیوانی نہیں
مصلحت کی بات لیکن کوئی بھی ٹالی نہیں
میرے ضبطِ دل کی قائل کون گھر والی نہیں
میری ماں کا تجربہ سب کام میرے آگیا
دنیوی آسائشوں کا راز میں نے پالیا
کس قدر سکھ اب مجھے گھر اور گھر داری میں ہے
اور تحفظ بھی بہت اس چار دیواری میں ہے
آج دُنیا کی نظر میں قابلِ عزت ہوں میں
کیا کہا تم نے کہ "اک ہاری ہوئی عورت ہوں میں"؟

○

جیتا نہیں وہ جنگ تو تقصیر کس کی تھی
یہ دیکھ اس کے ہاتھ میں شمشیر کس کی تھی

میں بھی شریکِ جرم سہی یہ مگر بتا
مجھ کو تباہ کرنے کی تدبیر کس کی تھی

کچھ تیرے خد و خال سے ملتی ہوئی ذرا
اس دل کے آئینے پہ وہ تصویر کس کی تھی

نازک تھی پھول سے بھی مگر ٹوٹتی نہ تھی
مجھ سے اُلجھ رہی تھی جو زنجیر کس کی تھی

ناآشنا ہیں اس سے وہ سب مجھ سے بے خبر
جو مجھ کو مل گئی ہے وہ نقشہ بہ کس کی تھی

ہے المیہ کہ آج اندھیروں کی زد میں ہے
اور سرزمینِ روشنی ہم سب کی تھی

سب اہلِ زر لے گئے جیتے تھے جو
نقدِ سخن سے شہر میں توقیر کس کی تھی

آبِ حیات

ایک جذبہ کہ جواں مرگ ہوا
ایک آدرش کہ جو ٹوٹ گیا
ایک سپنا کہ جو شرمندۂ تعبیر نہ ہونے پایا
ان پہ اب نوحہ کناں رہتے ہو
اک کسک دل میں لیے پھرتے ہو
اک خلش رکھتی ہے بے چین تمہیں
یاد کے شہر میں در بند کیے بیٹھے ہو
ان دل آسا گذراں ساعتوں کو یاد کرو
لے کے آئی تھیں بشارت جو ادھورے پن کی
ساتھ ہی شکر کرو اپنے ستاروں کا ادا

جن کی گردش سے ملا
تم کو عرفان نشاطِ غم کا
یاں کسی نے بھی اگر
وقت کی ریت کو مٹھی میں دبانا چاہا
ایک تتلی کی طرح اڑتے ہوتے لمحے کے
کاٹ کر پر
ابدی اس کو بنانا چاہا
ایڑیاں رگڑیں بہت جذبوں نے
صورتیں مسخ ہوئیں خوابوں کی
اور آدرش ابوالہول بنے
جیسے ہو شمہ ہجران کو
نہ تمنائے بقا
شاید آتا ہی نہیں راس انہیں آبِ حیات

تین شعر

منظر سے مرے دل کے وہ ہٹتا ہی نہیں ہے
اِک شعر جو مجھ پر کبھی اترا ہی نہیں ہے

ہوگا وہ کسی اور ہی دُنیا کا، مگر ہے
اک خواب جو میں نے ابھی دیکھا ہی نہیں ہے

ڈھونڈے سے خدا ملتا ہے انسان ہے وہ تو
تم نے کبھی شبنم اُسے ڈھونڈا ہی نہیں ہے

ایک دفعہ کا ذکر ہے

ملی تھی مجھ کو اک بوڑھی طوائف ایک محفل میں
جو خود پیشہ نہیں کرتی تھی" اک چکلا چلاتی تھی
مرے جیسی گھریلو بیویوں کے دل جلاتی تھی
تھی اس کے ساتھ اک من موہنی سی نوجواں لڑکی
جو اس رنگین محفل میں برائے رقص آئی تھی
کہ صاحب خانہ کو صورت اس البیلی کی بھاتی تھی
یونہی بس اتفاقاً دونوں میرے پاس آ بیٹھیں
بہت ہی زعم میں تھی میں کہ اپنی پاکبازی کے
ذرا سی دیر میں اوقات ان کی ان کو سمجھا دی
بہت سا بوجھ لے کر پھر رہی ہو تم گناہوں کا

حسابِ عاقبت کا خوف بھی تم کو نہیں آتا
یہ سن کر رنگ جیسے اڑ گیا لڑکی کے چہرے کا
ندامت سے سر اس کا جھک گیا بھر آئیں آنکھیں بھی
مگر بڑھیا جو ناچ اوروں کو تگنی کا نچاتی تھی
نظر بازوں کو جو گھر بار کی سدھ بدھ بھلاتی تھی
تاثر لینے والی تھی بھلا وہ ایسی باتوں کا
ہنسی پہلے تو وہ اپنے مسی آلود ہونٹوں سے
مرے کانوں میں پھر بولی وہ سرگوشی کے لہجے میں
"یہاں پہ ناچنا پڑتا ہے سب کو پیٹ کی خاطر
ہمیں غیروں کے آگے تم کو شوہر کے اشاروں پر"

○

یوں زیست ایسی بے سروساماں تو یاں نہ تھی
جس کو جہاں پہ ہونا تھا وہ شے وہاں نہ تھی

صُورت گروں میں اہلِ ہُنر کم نہ تھے مگر
کرتے تھے جس کو نقش وہ صورت عیاں نہ تھی

دشتِ وفا میں راہ نوردوں کے پاؤں کی
مٹی تھی دے رہی تھی جو لو کہکشاں نہ تھی

حیرت ہے جس کا دل میں ترازو ہُوا تھا تیر
تھی اور ہی کسی کی وہ اس کی کماں نہ تھی

عائد تھیں یا تو حرفِ تمنا پہ قدغنیں
یا پھر غریبِ شہر کے مُنہ میں زباں نہ تھی

رزقِ زمیں بنا تو عزیزِ جہاں ہُوا
فن کار جس کو رُوئے زمیں پہ اماں نہ تھی

○

یوں تو سے ہو بھی چکا ترکِ محبت کرنا
کتنا مشکل ہے مگر خود اسے رخصت کرنا

اب کسی شہر میں بھی خوش نہیں رہنے دیتا
وہ ترے شہر سے میرا کبھی ہجرت کرنا

ابھی پایا بھی نہیں تھا کہ اسے کھو بھی دیا
اپنی عادت ہے ہر اک کام میں عجلت کرنا

سب کی کہہ لیتے ہیں ہم سامنے اس کے لیکن
سخت مشکل ہے بیاں دل کی حکایت کرنا

بے وفائی سے تری بڑھ کے عجب بات تھی کیا
کسی اَن ہونی پہ اب کس لئے حیرت کرنا

○

پھیلا کے جا رہا ہے کہاں ہات، تو نہ جا
بٹنے دے بٹ رہی ہے جو خیرات، تو نہ جا

ہے قصرِ شہہ پہ ایک ہجوم گداگراں
سنتا نہیں ہے کوئی وہاں بات، تو نہ جا

ہوتا ہے لین دین تو ہونے دے تجھ کو کیا
چُک جائیں گے یہیں پہ حسابات، تو نہ جا

پھرتے ہیں لوگ لے کے وہاں تیغِ بے اماں
اچھے نہیں ہیں شہر کے حالات، تو نہ جا

لفظوں کا بھید بھاؤ ہے کارِ جنوں ابھی
تجھ کو ملے گی بس یہی سوغات، تو نہ جا

گروی رکھیں گے تیری انا جام کے عوض
دھوکا ہے سب درونِ خرابات، تو نہ جا

اک جوئے خوں ہے کوچہ و بازار میں رواں
اور گھات میں ہے مرگِ مفاجات، تو نہ جا

شبنمؔ ملے گا کیا درِ دنیا پہ جا کے بھی
رکھنی ہے تجھ کو عزتِ سادات، تو نہ جا

○

شہرِ جاں میں اب بھی کچھ کچھ روشنی موجود ہے
بجھ چکا ہے درد لیکن بے کلی موجود ہے

سر بریدہ لال کن ماؤں کے بکھرے ہیں یہاں
پھول تو مرجھا گئے ہیں تازگی موجود ہے

آرزوئیں کم نمو خوابوں کے ریشم منتشر
شاید اپنی خواہشوں میں بے دلی موجود ہے

ہو بھی جاتے ہیں ہم یہ دیکھ کر اپنا مفاد
دشمنوں کے درمیاں بھی دوستی موجود ہے

کتنی باتیں ہیں کہ جو خود سے بھی کر سکتے نہیں
اپنے اندر جیسے کوئی اجنبی موجود ہے

باوضو ہو کر گزرتے ہیں جہاں سے آج بھی
شہرِ دل میں ایک ایسی بھی گلی موجود ہے

تنبیہہ

میں جس پھول کو ہاتھ لگاؤں' پھول وہ مرجھا جائے
اِک پل جب دیپک کو دیکھوں' وہ دیپک بجھ جائے
جس پہ میں نظریں ڈالوں' وہ تارہ ڈوبا جائے
بیٹھوں پیڑ ہرے کی چھاؤں' پیڑ ہی سوکھا جائے
میں تو سونے کو چھو لوں تو وہ مٹی بن جائے
تم ہو قسمت والے' دیکھو' مجھ سے دُور ہی رہنا۔

دیر آید

بہت سے مرحلوں سے زندگی کے جب گذر آئی
تو یہ احساس جاگا ہے۔
برتتی آ رہی ہے آج تک یہ زندگی مجھ کو
بسر کرتی رہی ہے آج تک یہ زندگی مُجھ کو
سراسر ہے یہ استحصال میرا
سراسر ایک دھوکا ہے
مجھے بخشی گئی ہے یہ
مرے ہی واسطے ہے یہ
سو برتوں گی اِسے اب مَیں
بسر اس کو کروں گی آج سے مَیں

مگر یہ طے کیا جب، اُس گھڑی تک
بلائے ہشت پا یہ
مجھے پوری طرح بے دست و پا
کر بھی چکی تھی۔

قُم بِاِذن اللہ کی تاثیر اک آواز میں

(اپنے بڑے بیٹے وقار کے لئے ایک نظم)

مَیں کہ مردہ ہوئی پیدا
پہلی آواز تری کان میں جیسے آئی
اسی لمحے سے میں ہونے لگی زندوں میں شمار
تو مسیحا ہے مرا

○

جسم و جاں کی روشنی! تُو میری دشمن بن گئی
دوست ہو کر زندگی! تُو میری دشمن بن گئی

ایک پل میں مجھ سے مانگا لمحے لمحے کا حساب
ساعتِ خود آگہی! تُو میری دشمن بن گئی

زندگی بھر تو نے اپنے سحر میں رکھا اسیر
حرف کی نیلم پری! تُو میری دشمن بن گئی

دوسروں کے واسطے کتنا لہو اُبلا کیا
شاعری اے شاعری! تُو میری دشمن بن گئی

دہر کی آسائشیں بے رنگ ہو کر رہ گئیں
رُوح کی آسودگی! تو میری دشمن بن گئی

چھین لی اک چھب دکھا کر مجھ سے بینائی مری
عشق کی تابندگی! تو میری دشمن بن گئی

○

پہلے تو اپنا گم شدہ لشکر تلاش کر
پھر رہزنوں کی تیغِ ستم گر تلاش کر

اس کے بغیر خود تری پہچان کھو گئی
کل جس میں رہ رہا تھا وہی گھر تلاش کر

اے شہرِ سنگ دل کے مکیں! سوچتا ہے کیا
پتھر اٹھا کے کانچ کا پیکر تلاش کر

رکھ دار و گیر میں پسِ پردہ تلاشِ خیر
دل لاکھ ورغلائے کہ تو شر تلاش کر

جو روشنی کی سمت کھلے اور کھلا رہے
دیوارِ قصۂ دل میں وہ اک در تلاش کر

لفظوں کی بازی گر ہوں، مجھے شاعری سے کیا
اپنی ثنا کو کوئی سخن ور تلاش کر

دو شعر

بیڑی مرے پاؤں کی پھر خون میں تر دیکھو
انجام کو رہنے دو آغازِ سفر دیکھو

رنگین ہوا کیسا وہ خون سے اب میرے
کھلتا نہیں جو مجھ پر تم جا کے وہ در دیکھو

ایک شعر

غم کے معنی جاننے میں دل مرا کمتر رہا
میرے غم میں تو ہمیشہ خوف کا عنصر رہا

امام عالی مقام کے حضور ہدیۂ سلام

تمہارے شہر میں اک قافلہ سا اترا تھا
وفا نباہنے والوں کا دردمندوں کا
زمیں پہ خیر کے طالب خدا کے بندوں کا
عجب سلوک روا تم نے ان سے رکھا تھا
بہت حقوق ہوا کرتے ہیں مسافر کے
گواہ اس کے مقدس صحیفے ہیں سارے
تمہارے گھر میں وہ مہمان تھے یہ سوچا تھا
غریب شہر مسلمان تھے یہ سوچا تھا
غریب آبلہ پا تھے شکستہ حال بھی تھے
صعوبتوں سے سفر کی بہت نڈھال بھی تھے
صداقتوں کے امیں تھے وہ عظمتوں کے سفیر

کہ ان کے پاس تو سب کے لئے تھا کلمۂ خیر
تم آشنا تھے کہ یہ تشنہ لب جو آتے ہیں
دیارِ حق سے محبت کی چھاؤں لاتے ہیں
جلا دیئے سرِ صحرا مگر انہیں کے خیام
تمہارے واسطے لائے تھے روشنی کا پیام
وہ جن کے سامنے خود آفتاب جھکتا تھا
چراغِ کون و مکاں وہ بجھا دیئے تم نے
زمین شوق سے سو بار چومتی تھی جنہیں
سفید پوش وہی خاک و خوں کی نذر کیئے
وہ جن کے دشمنِ جاں تم تھے خوں کے پیاسے تھے
خبر بھی ہے کہ محمدؐ کے وہ نواسے تھے
مجھے یقیں ہے کہ اے اہلِ شہرِ سنگ دلی!
معاف کر دیا ہوگا انہوں نے تم کو بھی
بلند حوصلے ان کے، مزاج ان کے غنی
مگر وہ صبرِ مجسم حسینؑ ابن علیؑ
تم اس کے خون کا احسان کیسے بھولو گے
تمہاری ریت کو سونا بنا دیا اُس نے

مقبوضہ کشمیر میں آزادی کی جدوجہد میں شہید ہونے والوں کے نام

جیالے نوجواں ایسے
جنہیں پیاری تھی اپنی جاں سے بھی
آئندہ نسلوں کی سرافرازی
ہوتے قربان اپنی سرزمیں پر ایسی سج دھج سے
کہ اُن کی لاش تک بھی
گھر نہیں پہنچی
تو ان کی ماؤں کو پھر صبر آخر کس طرح آتا
مگر اک روشنی آواز بن کر
انہیں پیغام دیتی ہے برابر

”نہ ڈھونڈو تم زمیں پر
شہیدوں کے وہ سب اجسامِ خاکی
کہ ربِّ دوجہاں کے حکم سے
جنہیں زندہ اٹھایا جاچکا ہے“

قائدِ اعظم کے حضور نذرانۂ عقیدت

یہ تحفظ مرے گھر کو تیرے دم ہی سے ملا
تو نے بخشی مرے قائد مجھے عزت کی ردا

تو کہ اک پیکرِ ہمت تھا تجھے مان گئے
حوصلہ جینے کا ہم جیسوں کو تو نے ہی دیا

قافلہ جو کہ تہی دست تھا، بے سایہ تھا
راہبر اس کا بھی بننا تجھے منظور ہوا

تھی مصائب کی کڑی دھوپ مگر اپنے لئے
سائباں تو تھا گھنے پیڑ کا اک سایہ تھا

میرے خوابوں کو حقیقت میں بدلنے والے!
تیرے احسان کا میں شکر کروں کیسے ادا

مشعلِ شعر کا نذرانہ ہے بس میرے پاس
تیری یادوں کا محل اس سے چمک اٹھے گا

○

موسم کئی بدلے ہیں، مقدّر نہیں بدلا
ویسا ہی شکستہ ہے مرا گھر نہیں بدلا

شوریدہ سری آنکھ کے دریا کی وہی ہے
اور ساحلِ دریا پہ بھی منظر نہیں بدلا

اس سے بھی مرے شوقِ تنوّع کو گلہ ہے
ہمزاد تھا میرا تو وہ کیونکر نہیں بدلا

گردش تو زمانے کی بہت میں نے سہی ہے
پر اس سے مری سوچ کا محور نہیں بدلا

الفاظ نئے ہیں مگر افکار پرانے
دستار تو بدلی ہے مگر سر نہیں بدلا

سچا تھا تو لہجے پہ رہا اپنے وہ قائم
رُخ بدلا ہَوا کا تو سخنور نہیں بدلا

○

کب کریں گرا سے اب یاد نہیں کرنا ہے
وقت کم ہے اسے برباد نہیں کرنا ہے

اِک اُسی شہر کے سب خواب دکھاتے ہیں ہمیں
جس کو اس دشت میں آباد نہیں کرنا ہے

دسترس میں ہیں ہماری کتنی خوشیاں بھی مگر
دل کو اس سودے میں ناشاد نہیں کرنا ہے

دلِ وحشی کو بھی معلوم ہے وہ کون سی ہے
ایک دنیا جسے برباد نہیں کرنا ہے

کتنے آرام سے سب ہم کو یہ سمجھاتے تھے
ٹھان لو دل میں اسے یاد نہیں کرنا ہے

ہے یہی آگ تو جل جائے گا سب شہرِ نوا
ہم کو مرجانا ہے فریاد نہیں کرنا ہے

○

کبھی جلتا ہوا دیکھا تھا کسی اور کا گھر
آج تک خوف سا ہے اس کا مسلط دل پر

ہر نئے زخم پہ بھولے ہیں پرانے کئی زخم
زہر نے زہر کا زائل کیا دل پر سے اثر

سبز پتوں میں لگی آگ تو وہ جل تو اٹھے
راکھ بننے میں بڑی دیر لگی ان کو مگر

حال کو بھی کہیں کھا جائے نہ گھن ماضی کا
ہر نئے شہر میں خوش رہنے کا سیکھو تو ہنر

بھرے میلے سے تو لوٹ آئے ہیں کچھ سوچ کے ہم
اب بھلا اس کے مناظر کو بھلائیں کیونکر

جو روش باغ کی پھولوں سے لدی رہتی ہے
اس کے نزدیک ہی گرنے کو ہے اک کہنہ شجر

میرا گھر بھر میرے بچوں کی ہنسی سے گونجے
کبھی فرصت ہو میسر تو اتاروں میں نظر

کورے کاغذ پہ پڑے سوتے رہیں گے کب تک
ہم نے لفظوں سے تراشے ہیں جواب تک پیکر

○

زمانے بھر سے انوکھا رکھا چلن ہم نے
جہاں میں عام کیا رہبری کا فن ہم نے

اب اس کو اوروں میں بانٹیں تو سر سے قرض اترے
وصول کی تھی جو سورج کی اک کرن ہم نے

ہمارے نقشِ قدم ہیں نویدِ فصلِ بہار
قدم قدم پہ سجائے نئے چمن ہم نے

ہر ایک سانس ہماری اسی میں کام آئی
کسی بھی طور سہی، دُور کی گھٹن ہم نے

وہی تو ماتھے پہ آنکھیں سجائے پھرتے ہیں
وہ چہرے جن کو دیئے سوچ کے سخن ہم نے

کبھی کبھی اسے پھر سے اوڑھنے کو جی چاہے
کہاں رکھا وہ مسرّت کا پیرہن ہم نے

○

تجھ کو مجھ سے کون سا بے باق کرنا تھا حساب
اضطراب اے اضطراب اے اضطراب اے اضطراب

وقت کی شطرنج کے مہرے بنے اور پٹ گئے
تیرے دعوے میرے وعدے دونوں کے دیرینہ خواب

میں نے وہ اوراق ہی اس میں سے غائب کر دیئے
تھا کتابِ جاں میں جو خوابوں کے ابریشم کا باب

وقت کے سیلاب میں وہ سیپیاں بھی بہہ گئیں
گونجتا رہتا تھا جن میں تیری یادوں کا چناب

غیر کے رحم و کرم پر تیری میری زندگی
وہ ہمارے سانس لینے کا بھی رکھتا ہے حساب

کچھ گھنے پیڑوں کے سائے میں اُگے پودے ہیں ہم
اپنے بڑھنے کی تمنا ایک دھوکا اک سراب

معذرت کرتے ہوئے لگتے تھے اپنے آپ سے
میرے بچپن کا زمانہ اور مرا عہدِ شباب

○

اب ایک اور مسافت کا حوصلہ بھی تو ہو
پلٹ ہی جائیں مگر کوئی راستہ بھی تو ہو

شکستہ پائی، یہ بے معنی سا سفر، یہ شام
میں رک تو جاؤں مگر کوئی روکتا بھی تو ہو

ملے کہاں سے مرے دل، مگر تجھے تعبیر
اسیرِ خواب کوئی خواب آشنا بھی تو ہو

اگر یہ شہرِ خموشاں نہیں تو پھر کیا ہے
کہ سارے چپ ہی سہی ایک بولتا بھی تو ہو

بگڑ چکے ہیں جو سب کام خود سنور جائیں
ہمارے حق میں کوئی ایسا معجزہ بھی تو ہو

معاف کرنے کا خود کو جواز کیسے ملے
عدو سے اپنے مجھے تھوڑا سا گلہ بھی تو ہو

میں اس کے حکم پہ غرقابِ غم بھی ہو جاؤں
مگر وہ میرا خدا میرا ناخدا بھی تو ہو

ایک شعر

زرخیز تھی خیال کی وادی بہت مگر
لفظوں کا لے کے ڈوب گیا بانجھ پن مجھے

○

کانٹے چبھتے ہیں چبھیں پاؤں میں چلتے جائیں
راکھ بننے سے تو بہتر ہے کہ جلتے جائیں

طبع روشن رہے ایسے ہی فروزاں اپنی
اور ہم شمع کی مانند پگھلتے جائیں

جنہیں رکھا نہ لگاوٹ کے بھی زمرے میں کبھی
رفتہ رفتہ انہیں باتوں سے بہلتے جائیں

دے نیا عزم کہ ہمیں پھر سے سنبھالے آ کر
سحر سے نیر سے بھی اب ہم تو نکلتے جائیں

خواہشیں ساتھ ہی چلتی ہیں جدھر بھی جائیں
ہم کہاں تک انہیں قدموں سے مسلتے جائیں

لہُو کے دریا سے نکلتا ہُوا سورج

فلسطین ! اے مسلموں کی زمینِ دریدہ بدن
قسم بیت اقدس کے خاموش
دھندلے، غمیں، سوچتے گنبدوں کی قسم
درد کے ان جری قافلوں کی قسم
منزلوں، راستوں، راحلوں کی قسم
ہاں قسم اس لہو کی
جو دریائے اردن میں بہتا رہا
اپنی بے تاب لہروں کی آواز میں
تیرے اندوہ کو گنگناتا رہا
احمریں گیت گاتا رہا

قسم تیرے بیٹوں کی اور بیٹیوں کی
جو اپنے جواں، مہرباں کامراں ہاتھ پہ
اپنی "سر مشعلیں" لے کے جلتی رہیں
(رات اُمڈی رہی، شمعیں جلتی رہیں)
قسم ان جواں تر کھجوروں کی جو
اپنی شاخوں پہ مٹی کی چادر لئے
زخم کھاتی رہیں
سر اٹھاتی رہیں
مسکراتی رہیں
تیرے زیتون کی ڈالیوں کی قسم!
تیرے فردا کی خوش حالیوں کی قسم!
تیرے خوابوں!
خیالوں، امنگوں کی
ان پالنے والیوں کی قسم!
تیری عظمت کا سورج چمکنے کو ہے
ریت اب اپنا سونا اگلنے کو ہے

○

الاؤ سا اک دہک رہا ہے زمینِ دل پہ
نہ بیٹھے ہرگز کوئی بھی اب شہ نشینِ دل پہ

مکان دل کا ہے گو نئے زلزلوں کی زد میں
اثر ہوا ہو نہیں پرانے مکینِ دل پہ

ہے مصلحت کا غبار اس کے چہار جانب
یقین لائے تو کیسے لائے وہ دینِ دل پہ

وہ ایک آنسو کہ آنکھ سے جو کبھی نہ ٹپکا
ستارا بن کے چمک رہا ہے جبینِ دل پہ

قدم خوشی سے زمیں پہ ٹکتے نہیں تھے اپنے
تھا جب تسلط کا زعم اس سرزمینِ دل پر

○

ہر ایک پیڑ تو ساکت دکھائی دیتا ہے
ہوا کا شور کہاں سے سنائی دیتا ہے

میں اپنے آپ سے جب صلح کرنا چاہتی ہوں
تو کوئی مجھ میں برابر دہائی دیتا ہے

شکار پھر دلِ وحشی نہ ہو رہا ہو کہیں
لہو میں شور سا میرے سنائی دیتا ہے

سیاہ رات کی پٹی ہے میری آنکھوں پر
خوشا کہ پھر بھی مجھے سب دکھائی دیتا ہے

کبھی کبھی دل و جاں روشنی میں آتے ہیں
"کبھی کبھی کوئی چہرہ دکھائی دیتا ہے"

لہو سے اپنے تو انسان ہو گا مخلص ہی
وہ اس خیال سے یوسف کو بھائی دیتا ہے

○

اب تعلق نہ واسطہ ہے کوئی
بے سبب یاد آرہا ہے کوئی

میں کہاں اور کہاں یہ سمجھوتے
میرے پردے میں دوسرا ہے کوئی

مجھ سے دنیا فقط یہ چاہتی ہے
میں بھی کہہ دوں کہ بے وفا ہے کوئی

کیا یہ کافی نہیں کہ خوابوں میں
آج تک ساتھ چل رہا ہے کوئی

خوش ہوں اے دل کہ آج بھی مجھ کو
میری آنکھوں سے دیکھتا ہے کوئی

تن کی بگیا مہک اٹھی ساری
موتیا بن کے کِھل رہا ہے کوئی

○

کبھی عزیز ہیں طوفاں کبھی کنارے ہیں
عجب عجب مری خواہش نے روپ دھارے ہیں

فضا بتائے گی جب وہ قریب پہنچے گا
کہ شہرِ غم کے بھی اپنے کچھ استعارے ہیں

کرے وہ قوتِ گویائی بھی عطا مجھ کو
صحیفے جس نے مرے قلب پر اتارے ہیں

نہ کھاؤ خوف اندھیروں سے قافلے والو!
تمہاری آنکھ میں آنسو نہیں ستارے ہیں

ہمیں تو راس نہ آئے وصال کے لمحے
بڑے سکون سے فرقت کے دن گزارے ہیں

شکستِ دل نے ہمیں کیا نہیں دیا شبنمؔ
یہ پوچھ ان سے جو جیتے کبھی نہ ہارے ہیں

تو قادرِ مطلق ہے مگر تیرے جہاں میں

شب کے ملبے میں ہوا دفن چلو یہ دن بھی
موت کی جتنی رسومات بھی ہوتی ہیں، ہوئیں
اِس کی تدفین کے منظر میں تھی تقدیس بہت
اس کے تابوت پہ اک چادرِ شب رنگ سی تھی
اُس پہ اشکوں کے نشاں صاف نظر آتے تھے
اشک - آوردہ یکِ صرصرِ شبخونِ حیات
منتظر اُدھ کھُلی قبروں میں ہیں کچھ لوگ ابھی
منجمد اِک ہی سوال آنکھ میں ہے جن کی فقط
"پاٹی جائیں گی مگر کب یہ ہماری قبریں؟"

○

درمیاں میرے کسی غم کے نہ آؤ تم بھی
اب کسی دکھ کا مداوا نہیں، جاؤ تم بھی

کہتی ہوں اور یہ کہتے ہوئے شرمندہ ہوں
بھر سکو گے نہ مرے دل کے یہ گھاؤ تم بھی

میں اکیلی تو نہیں آگ کے اس دریا میں
لے کے آ پہنچے ہو کاغذ کی یہ ناؤ تم بھی

ہم تو سادہ ہیں جو گزری تھی سُنا دی سکھیو
اب ذرا اپنی کوئی بات سُناؤ تم بھی

کوئی اس جنس کا خواہاں نہیں شبنم اب تو
اپنے انکار کی دکّان بڑھاؤ تم بھی

ایک منظر

لاشے ارادوں کے یہ کچھ
تیرے مرے وعدوں کے کچھ
سوچوں کے کچھ خوابوں کے کچھ
لٹکے ہوئے ہیں برہنہ
کب سے فصیلِ شہر پہ
اِن کی کھلی آنکھوں میں ہیں
لکھے ہوئے لاکھوں سوال

جن کے جوابوں سے یہ سب
محروم جیتے ہی رہے
پڑتی ہے اس تحریر پہ
جس راہ رو کی بھی نظر
وہ خوف سے جاتا ہے کانپ

اور اس جہنم زار کے
منظر سے گھبرا کر بہت
اپنے قدم کرتا ہے تیز
چپ چاپ سر نیچا کئے
مڑ کر انہیں دیکھے بغیر
کیا ایک بھی ایسا نہیں ؟
جو وقت کی سولی سے اب
لاشے اتارے آکے یہ
اور یہ بھی گر ممکن نہ ہو
آنکھیں ہی ان کی ڈھانپ دے
سب کو بچا لے خوف سے

ایک دعا

رات سے پہلے مجھے فیصلہ کرنا ہے کوئی
رات آئے گی تو پھر ساتھ ہی آ جائیں گے
سارے اندیشے مرے اور مرے وسوسے سب
دہری سوچیں مری
ساتھ تذبذب میرا
رات کا سحر و فسوں
مجھے بے یار و مددگار سا کر ڈالے گا
مجھے کر دے گا وہ کمزور بھی اور بزدل بھی
مرے معبود
آج کے دِن کو ٹھہر جانے کے احکام سُنا

○

جنوں کو اذنِ مسافت ملے تو کافی ہے
نئے سفر کی بشارت ملے تو کافی ہے

گئے دنوں کی تلافی کہاں بہار سے اب
نئی رتوں کی شہادت ملے تو کافی ہے

خود اپنے آپ سے ہم کو بہت سی باتوں کی
وضاحتوں کی بھی مہلت ملے تو کافی ہے

وہ اپنے خواب گھروندے کہاں کہ ان میں سے
جو آج اک بھی سلامت ملے تو کافی ہے

محبتوں کا زمانہ گزر گیا اب تو
ذرا سی اس کی رفاقت ملے تو کافی ہے

اگرچہ کم ہے بہت زندگی مگر شبنم
جو اپنے آپ سے فرصت ملے تو کافی ہے

○

روشنی آنے دو، دیوار کو در ہونے دو
سحرِ شب ٹوٹنے دو، نورِ سحر ہونے دو

ایک پتھر پہ نہ ضائع کرو برسات اپنی
صدفِ چشم میں اشکوں کو گہر ہونے دو

دل ہو دریا تو توجہ اسے راس آتا ہے
روز پیدا مرے دریا میں بھنور ہونے دو

کبھی پندار نے دی بات نہ بننے اب کے
گفتگو اس سے بہ اندازِ دگر ہونے دو

ڈالنے دو مجھے اشیا کی حقیقت پہ نظر
نیست ہوتا ہے جو خوابوں کا نگر، ہونے دو

فہرست